Date of Publication : 23-09-2014 PRICE Rs. 2/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 24-25Sep. 2014 R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 October 2014
Issue: 37, Vol.:73

یکم تا ۷ راکتوبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۳۷، جلد نمبر: ۷۳

اردو کے حق میں سپریم کورٹ کے تاریخ ساز فیصلے کے بعد پورے ملک خاص طور سے اترپردیش میں اردو کی ترقی اور فروغ کا کیا لائحۂ عمل ہونا چاہیے، زیر نظر مضمون میں اسی موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جب تک اسکولی سطح پر اردو کو نظام تعلیم کا حصہ نہیں بنایا جاتا تب تک اردو کے احیا کی کوئی کوشش صحیح معنوں میں کامیاب نہ ہوسکے گی۔

سپریم کورٹ کے تاریخی فیصلے کے بعد

فروغِ اُردو کا لائحۂ عمل

اطہر فاروقی

جب سپریم کورٹ کی پانچ رکنی بنچ نے یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے والے قانون سے متعلق یوپی ہندی ساہتیہ سمیلن کے مقدمے پر فیصلہ محفوظ کیا تو میرا خیال تھا کہ یہ فیصلہ آنے تک میں آزادی کے بعد سے اب تک اردو تحریک کی مختصر تاریخ لکھ دوں گا اور آخر میں اس مقدمے پر لکھوں گا جو کسی نہ کسی شکل میں 1981 سے یوپی میں اردو کو قانونی حیثیت دینے کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور یہ کام میں نے قسطوں میں کیا جو اس اعتبار سے خاصا مشکل تھا کہ 67 برسوں کی تیز رفتار مخالف کے ہر زہریلے جھوٹ کو شمار کیے بغیر یہ کہانی اس نسل کو سنادی جائے جس کے لیے اب اردو جذباتی مسئلہ اس لیے نہیں کہ اردو سے ناواقف تین نسلیں گزر چکی ہیں۔ قانونی موشگافیوں کے تقریباً دو ہزار صفحات کو لفظ بہ لفظ پڑھنے کے بعد جب میں نے اپنے نوٹس تیار کر لیے تو سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا جس کے بعد ہمیشہ کے لیے تمام ہندستانی زبانوں بالعموم لسانی اقلیتوں کی زبانوں کے استحقاق Legitimacy کی راہ ہموار ہوگئی۔ اس بے مثال فیصلے کے بعد بھی اردو دنیا میں کوئی خاص ہلچل نہیں ہوئی۔ اردو اخبارات میں اس فیصلے سے متعلق شائع ہونے والی خبریں دیکھ کر لگا کہ اردو خود اردو اخباروں کے لیے بھی اب اس طرح اہم مدعا نہیں جس طرح وہ آٹھویں دہے تک تھی اور سب سے دلچسپ بات یہ کہ ہندی والوں نے جو آٹھویں دہے کے آخر تک — مع ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کے — اردو کا نام سننے کو تیار نہ تھے، اس فیصلے پر کسی ردعمل کا اظہار اس لیے نہیں کیا کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ وہ لوگ جو خود کو اردو والا کہتے ہیں اب اردو سے بالکل نابلد ہیں اس لیے، یہ فیصلہ اردو کو کسی قسم کا فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ آزاد ہندستان میں اردو کے نام پر بھی متعدد فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔ اردو کے نام پر آخری فساد بدایوں میں 1989 میں اس وقت ہوا جب اردو کو یوپی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ جب یہ طے ہوگیا کہ اب اردو یوپی کی دوسری سرکاری زبان بن جائے گی تو اردو مخالف قوتوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اب یوپی میں اردو سب کو لازماً پڑھنی ہوگی۔ بدایوں کی دیواروں کو اردو مخالفوں نے اردو کے خلاف زہریلے نعروں سے بھرا ہی نہیں بلکہ شہر کے آوارہ گدھوں کی پشت پر بھی جو نعرے لکھے ان میں ایک اب تک میرے ذہن پر مرتسم ہے: 'اردو تھوپی لڑکوں پر تو خون بہے گا سڑکوں پر'۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ آزاد ہندستان میں اردو کی کہانی صرف داستان بن کر رہ گئی ہے۔ شاید ایسا نہیں ہے۔ زندہ قومیں اکثر زوال کی جس حد تک پہنچ کر اپنے عظیم ماضی کے احیا کے لیے اچانک بیدار ہوجاتی ہیں، مسلمان اب اس قعر مذلت کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔

آئندہ سطور میں یوپی میں اردو کے مستقبل کے لائحۂ عمل پر گفتگو ہوگی جو صرف اور صرف اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم کے ذریعے ہی ممکن ہے اور جن جن صوبوں میں اردو تعلیم کے احیا کا لائحۂ عمل مرتب کرنے کا معاملہ ہے وہاں اب اردو اکادمیوں کو اردو تعلیم کے عمل میں شریک کیے بغیر چارہ نہیں۔ اردو اکادمیوں سے اردو تعلیم کا کام لینے کے لیے ان کے چارٹر میں تبدیلی کرکے اردو تعلیم کو اردو اکادمیوں کے دائرۂ کار میں لانا ہوگا۔ اردو اکادمیاں 1971 کے کوتاہ پرست راج کے ذہن کی پیداوار ہیں جب کہ ہندستان کی عوامی اور عمومی زندگی کے دریاؤں میں تب سے اب تک بہت پانی بہہ گیا ہے لیکن اردو اکادمیوں کی کشتی اب بھی اسی رکے ہوئے پانی پر تیر رہی ہیں جس پر اس نے 1971 میں اپنا سفر شروع کیا تھا اس لیے، نہ صرف اس پانی سے بے طرح بدبو اٹھ رہی ہے جس میں طرح طرح کے پانی کے جانور اور سانپ پائے جاتے ہیں بلکہ خود کشتی میں بھی متعدد سوراخ ہو چکے ہیں۔ اکادمیوں میں سب سے عجیب الخلقت کشتی اترپردیش اردو اکادمی ہی کی ہے جس کے ملاح گزشتہ کئی برسوں سے اکثر ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جنھیں کشتی اور بیل گاڑی کا فرق نہیں معلوم، اس لیے، وہ اردو کے تعلق سے حکومت کو بھی کوئی اہم مشورہ نہ دے پائے اور اترپردیش اردو اکادمی خیر پانگ بن گئی۔ اترپردیش میں اردو کے زوال کی بیشتر ذمہ داری یوپی اردو اکادمی کے اراکین اور سربراہوں کی ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ 1971 میں اندرا گاندھی کو اس بات کا احساس تھا کہ انھوں نے جس طرح پاکستان کو تقسیم کرا کر بنگلہ دیش کے قیام کی راہ ہموار کی تھی اسے ہندی مسلمانوں نے پسند نہیں کیا۔ بنگلہ دیش کا قیام جس طرح ہوا وہ کتنا صحیح یا غلط تھا یہ الگ بحث ہے مگر اندرا گاندھی کا چیزوں کو دیکھنے کا اپنا زاویہ تھا اس لیے، انھوں نے مسلم آبادی کے اعتبار سے اہم ترین صوبے اترپردیش کے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے وہاں اردو اکادمی کے قیام کا شگوفہ اردو والوں کے سامنے ڈال دیا۔

یہ 2014 ہے یعنی 1971 کو 43 برس گزر چکے ہیں اور نئی اقتصادی پالیسیوں

کو 23 برس۔ 23 برس کی اس مدت میں ہندستانی معاشرے خصوصاً شہری معاشرے اور مدنیت پر عمومی تعلیم یافتی سے تعلیمی مختلف شکل میں بہ آسانی شناخت کی جا سکتی ہے۔ اسکول سیکٹر میں بھی سرمایہ کاری محفوظ ترین اور سب سے منافع بخش کاروبار بن گئی ہے جس کی ایک مثال بمبئی میں کیتھل اسپانی گروپ کا عظیم الشان اسکول ہے۔ ہر چند کہ ہندو سرمایہ کار خدمت کے جذبے کے تحت ماضی میں بھی اسکول اور کالج قائم کرتے رہے ہیں جن کا مقصد سراسر غیر تاجرانہ ہوتے تھے۔ ہندستان کے تقریباً ہر قصبے یا شہر میں اغلب ہے کہ اس نوعیت کے ایک دو ادارے ضرور مل جائیں گے مگر انگریزوں کے ساتھ شریک اقتدار ہونے کے بعد اس ذیل میں ان لوگوں کا حصہ (Contribution) تقریباً ۰ کے برابر ہے جو خود کو مسلمان کہتے ہیں۔

1991 میں نئی اقتصادی پالیسیوں کا کوئی اثر اردو تعلیم پر نہیں پڑا اور آج بھی اردو تعلیم کا حال کم و بیش وہی ہے جو اردو کو ختم کرنے کی سازش کے تحت آزادی کے بعد کر دیا گیا تھا۔ جہاں اردو تعلیم کے ادارے ہیں ان کا معیار ان سرکاری اسکولوں سے بھی پست ہے جن کے طلبہ بارہویں پاس کرنے کے بعد بھی اس علاقائی زبان میں جو ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم ہے، ایک درخواست تک نہیں لکھ سکتے۔ جن صوبوں میں اردو اسکول خصوصاً اردو میڈیم اسکول بچ گئے ہیں وہاں بھی یہ ہوا کہ اکثر جگہوں پر اردو ذریعۂ تعلیم کے ڈگری سطح کے ادارے قائم نہ رہ سکے اور نہ ہی نئے ادارے قائم کرنے کی کوئی کوشش ہوئی جس کے نتیجے میں اردو میڈیم سے بارہویں پاس کرنے والے طلبہ کو پہلی ڈگری کے لیے کسی دوسرے میڈیم کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ پہلے سے ہی کم معیار کے اردو میڈیم کا تعلیم یافتہ جب ڈگری کالج کی سطح پر ایک بالکل ہی دوسرے میڈیم سے تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کی حالت آدھا تیتر آدھا بٹیر سے بھی بدتر ہوتی ہے اور چوں کہ اردو میڈیم کے ڈگری کالج وغیرہ موجود نہیں ہیں جب کہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ یعنی سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر TGT اور PGT گریڈ میں مدرس ہونے کے لیے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن ضروری ہے، اس لیے ہوتا یہ ہے کہ پھر وہ لوگ TGT اور PGT کے طور پر بھرتی کر لیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی پہلی اور دوسری ڈگری کسی اور میڈیم سے حاصل کی ہو۔ اردو میڈیم تعلیم کے پست معیار کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو تعلیم کے احیا کا ایجنڈا گزشتہ 67 برسوں سے اردو معاشرے کی توجہ کا مسلسل محتاج رہا ہے اور جب تک اردو تعلیم کا احیا اسکول کی سطح پر نہ ہوگا، اردو کے احیا کی کوئی کوشش دیگر سطحوں میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔

یوپی اردو اکادمی کے قیام کے دس برس بعد دہلی اردو اکادمی اور پھر دیگر صوبوں میں اردو اکادمیاں قائم ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اب قابل ذکر اردو آبادی والے تقریباً ہر صوبے میں اردو اکادمی ہے، ان صوبوں میں بھی جہاں اردو کا ایک بھی پرائمری اسکول نہیں۔ ان اکادمیوں کو اردو ثقافت کے فروغ تک محدود بہت سوچی سمجھی سازش کے تحت اس لیے رکھا گیا تاکہ اردو تعلیم کا فروغ نہ ہو اور آہستہ آہستہ اردو ثقافت اردو رسم خط جاننے والوں، اردو ادب کو اس کے رسم خط میں پڑھ کر سمجھ سکنے والوں میں اردو کلچر کا ذوق پیدا کرنے والوں کی غیر موجودگی میں اردو اسم مہمل بن کر رہ جائے۔ کسی بھی زبان کے ہمہ جہتی فروغ میں اس زبان کے ذریعے پرائمری اور سیکنڈری سطح کی تعلیم ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سطح پر اردو تعلیم کی عدم موجودگی میں اردو معاشرہ پوری طرح بے سمت قبیلہ بن کر رہ گیا ہے۔

آج حالات پہلے سے مختلف ہیں، اس لیے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے اردو اکادمیوں کو اپنے اپنے صوبوں میں اردو کی پرائمری اور سیکنڈری سطح کی تعلیم کا ذمے دار بنانے کے لیے حکومت پر زور ڈالیں۔ یہ کام ہر چند کہ آسان نہیں مگر اتنا مشکل بھی نہیں جتنا ساتویں دہے میں تھا۔ اردو تعلیم کا نظام درہم برہم ہونے کے بعد اردو معاشرے کے لیے وہ ماہرین تعلیم عجوبہ بن گئے جنھیں اردو تعلیم کے متعلقات سے دلچسپی ہو اس لیے، اگر اردو اکادمیوں کو اردو تعلیم کی ذمے داری دی جاتی ہے تو بھی وہ دس پندرہ برسوں کے بعد ہی اردو تعلیم کے متعلقات سے پوری طرح واقف ہو پائیں گی مگر تب تک ہندستانی معاشرہ پرائمری اور سیکنڈری سطح کی تعلیم کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکا ہوگا اور اردو تعلیم کے میدان میں اردو معاشرہ اور پیچھے چلا گیا ہوگا مگر اردو والوں کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں اردو اور اردو والے جن حالات سے گزرے اس کے بعد ان کے لیے اپنی بقا اور استحقاق کا سفر آسان نہیں تھا مگر جو حالات ہیں ان ہی سے نبرد آزما ہو کر اردو والوں کو آگے بڑھنا ہے جس میں وہ اکیسویں صدی میں بھی دوسرے درجے کے شہری ہی رہیں گے کیوں کہ تاریخ کا سفاک عمل قوموں کی خواہشات کا احترام نہیں کرتا۔

امید کہ وہ لوگ جو یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کی قانونی فتح پر اخبارات میں بے سر پیر کے بیانات دے رہے ہیں، اب اردو تعلیم کے احیا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور پہلے سے موجود اردو اکادمیوں سے اردو تعلیم کا کام لینے کے لیے صوبائی حکومتوں خصوصاً یوپی کی حکومت کو مجبور کریں گے۔

OO

> اکادمیوں میں سب سے عجیب الخلقت کشتی اتر پردیش اردو اکادمی ہی کی ہے جس کے ملاح گزشتہ تیس برسوں سے اکثر ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جنھیں کشتی اور بیل گاڑی کا فرق نہیں معلوم، اس لیے، وہ اردو کے تعلق سے حکومت کو بھی کوئی اہم مشورہ نہ دے پائے اور اتر پردیش اردو اکادمی خرپالنگ بن گئی۔ اتر پردیش میں اردو کے زوال کی بیش تر ذمہ داری یوپی اردو اکادمی کے اراکین اور سربراہوں کی ہے۔

عصمت چغتائی

اردو افسانے کی ٹیڑھی لکیر

ولادت: 21 اگست 1915 —— وفات: 24 اکتوبر 1991

سلام بن رزّاق (B-603، نیو آکار سی ایچ ایس، بالمقابل حیدری مسجد، نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ)
تھانے-401107 —— Email:zakirzahida@gmail.com

ترقی پسند عہد کے تین بڑے افسانہ نگار کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے ساتھ عصمت چغتائی کا ذکر ناگزیر ہے۔

عصمت چغتائی نے آزادی سے کچھ پہلے لکھنا شروع کیا اور اپنی باغیانہ فکر، بے باکانہ طرز اظہار، زنانہ بامحاورہ زبان، شوخ اور بے لاگ مکالموں کے سبب اردو افسانے میں بہت جلد اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا۔

ان کے افسانوں کا مرکز اور محور شمالی ہندوستان کے نچلے متوسط مسلم گھرانے ہیں جہاں جدید تعلیم کی کمی اور جنسی دباؤ کے سبب افراد خاندان اعصابی تناؤ اور جنسی کج روی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے افسانے اسی قدامت پسند ماحول، فرسودہ روایات اور ان کے بوسیدہ اخلاقی نظام کو بے نقاب کرتے ہیں بالخصوص عورت کے جنسی دباؤ اور نفسیاتی گھٹن کی بے لاگ بلکہ بے درد ترجمانی ان کے افسانوں کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتی ہیں۔

"جنس کا موضوع، گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیویوں کے لیے بہت اہم ہے۔ میری افسانہ نگاری اس گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے۔ فوٹوگرافی ہے۔"

طالب علمی کے زمانے میں کرشن چندر اور ابن صفی میرے پسندیدہ ادیب تھے۔ اس وقت تک میں نے عصمت چغتائی کے شاید دو چار افسانے پڑھے ہوں گے۔ بعد ازاں میں نے ۱۹۶۳ء کے آس پاس بمبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ابھی باقاعدہ لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ میں بمبئی میں نووارد تھا اس لیے بمبئی کی ادبی محفلوں سے بھی کوئی علاقہ نہیں تھا۔ چند برس بعد جب مکتبہ جامعہ پر میرا آنا جانا شروع ہوا تو دھیرے دھیرے بمبئی کے ادبی ماحول سے بھی شناسائی ہوئی۔ کرشن چندر، سردار جعفری، ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی اور اختر الایمان وغیرہ کو ادبی جلسوں، مشاعروں یا محفلوں میں دور دور سے دیکھ لیتا تھا۔ عصمت چغتائی اپنی قلمی مصروفیات کے سبب بمبئی کی ادبی محفلوں میں کم ہی شریک ہوتی تھیں۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ میری ان سے پہلی ملاقات ایک ادبی نشست میں ہی ہوئی۔

غالباً ۷۵-۱۹۷۴ء کی بات ہوگی اس وقت میرے افسانے، شاعر، کتاب، آہنگ، شب خون جیسے جرائد میں چھپنا شروع ہو گئے تھے۔ ناگپاڑہ نیبر ہڈ ہاؤس

میں کسی ادبی تنظیم نے شام افسانہ کی محفل منعقد کی تھی۔ انور خان، انور قمر اور علی امام نقوی سمیت اس زمانے کے تقریباً چھ سات نئے لکھنے والوں کو افسانہ خوانی کے لیے مدعو کیا گیا تھا مجھے بھی افسانہ پڑھنا تھا۔ اس سے قبل چھوٹی موٹی نشستوں کے علاوہ کسی بڑے جلسے میں افسانہ سنانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ جلسے کی صدارت عصمت آپا کرنے والی تھیں ان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ محفلوں میں برقی جھنڈو کی طرح چمکتی ہیں اور جس پر گرتی ہیں اسے خاکستر کر کے رکھ دیتی ہیں۔

جلسہ گاہ میں جاتے ہوئے میں قدرے نروس تھا لیکن یہ بھی اطمینان تھا کہ وہاں افسانے پڑھنے والے سبھی میری طرح نو آموز اور نووارد ہیں۔ میر بڑ کا بڑا سا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جلسہ شروع ہوا۔ عصمت آپا کرسی صدارت پر متمکن تھیں۔ میں نے اپنا افسانہ 'ٹوٹے شیشے کے عکس' سنایا جو بعد میں 'الہام' کے نام سے میرے افسانوں کے پہلے مجموعے 'ننگی دوپہر کا سپاہی' میں شامل ہے۔ افسانہ کافی پسند کیا گیا افسانہ خوانی کے بعد سامعین نے افسانہ نگاروں سے کچھ سوالات بھی پوچھے۔ افسانہ نگاروں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق جوابات دیے۔ درمیان میں افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے عصمت آپا بھی لقمے دیتی تھیں۔

میرے افسانے میں ایک سچویشن تھی جس میں راوی کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ موت کے تیسرے دن مرحوم کی روح کو سکون پہنچانے کی خاطر فقیروں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد کرتے پاجامے کے لیے جتے جتے گز یا کپڑا بھی نذر کیا جاتا ہے تاکہ عالم بالا میں اس کی روح کو ثواب ملے۔ جب فقیر رخصت ہونے لگتے ہیں تب راوی جو ابھی نوعمر ہے ان کے پاس جاتا ہے اور انھیں دس روپے کا نوٹ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے

"شاہ صاحب! میرے والد اچھے کھانوں کے ساتھ شراب کے بھی شوقین تھے۔ یہ چھوٹی سی رقم نذر کرتا ہوں اس کا ایک ایک پیگ لے لیجیے کہ مرحوم کی آخری خواہش یہی تھی۔"

وقفۂ سوالات کے درمیان ایک باریش شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا: "سلام بن رزاق بتائیں کہ ان کے افسانے میں فقیروں کو دس روپے کیوں دیے گئے۔" سوال پوچھنے والے کے لہجے میں ہلکی سی برہمی بھی تھی۔ میں گھبرا گیا... کیا جواب دوں؟... عصمت آپا نے میری طرف دیکھ کر کہا "سلام جواب دو" میں بوکھلایا ہوا سا مائک پر آیا اور اسی بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "اس لیے کہ اس وقت میرے پاس دس ہی روپے تھے..." اور فوراً جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ جواب تو جھلاہٹ میں دے دیا مگر پتہ نہیں سامعین نے اس کا کیا مطلب نکالا۔ ہال میں قہقہوں کا طوفان سا آ گیا... وہ ایک طرف سے 'بہت خوب بہت خوب' کے نعرے بھی بلند ہوئے۔ عصمت آپا بھی ہنسنے لگیں اور وہ شخص کھسیایا ہوا سا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ عصمت آپا نے صدارتی تقریر میں نئے افسانہ نگاروں کی خوب تعریف کی... میرے افسانے کا بطور خاص ذکر کیا... یہ ان سے میری پہلی شناسائی تھی۔

انھی دنوں ممبئی میں دوردرشن نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ سردار جعفری صاحب 'گفتگو' کے نام سے ایک ادبی پروگرام کی میزبانی کرتے تھے۔ ایک مذاکرے میں انھوں نے مجھے اور انور قمر کو مدعو کیا عصمت آپا بھی ہمارے ساتھ مذاکرے میں شامل تھیں۔ نیا اور پرانا افسانہ موضوع گفتگو تھا۔ مذاکرے کی پوری تفصیل تو یاد نہیں صرف جعفری صاحب کا ایک سوال یاد رہ گیا جو انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "جدیدیت کے حامی ترقی پسندوں سے اس قدر بدظن کیوں رہتے ہیں؟" جعفری صاحب نئے لکھنے والوں کو بھی شاید جدیدیت کا حامی سمجھ رہے تھے۔ اس سوال پر پہلے تو میں گو مگو کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ پھر قدرے سنبھل کر بولا۔

"انھیں ترقی پسندوں کے آمرانہ رویے سے شکایت ہے۔"

جعفری صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"آمرانہ رویے سے کیا مراد ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں یا انور قمر کچھ کہتے... عصمت آپا نے بات اچک لی اور جدیدیوں اور جدیدیت نوازوں کو بے نقط سنانا شروع کر دیا۔

"ارے کوئی آمر وامر نہیں... انٹی کمیونسٹ بلاک والوں نے یہ الزام تراشا ہے۔ وہ کیا جانے ترقی پسند ادیبوں نے کس طرح Survive کیا ہے۔ جدید ادیبوں کو چاہیے کہ ترقی پسندوں کو بجائے گالیاں دینے کے اپنی تحریروں پر بھروسہ کرنا سیکھیں۔"

... جعفری صاحب نے درمیان میں ٹوکا۔ مگر انھوں نے سنی ان سنی کر دیا۔ پورے انٹرویو میں وہ اسی طرح بار بار مداخلت کرتی رہیں۔ انٹرویو کے اختتام پر جعفری صاحب نے عصمت آپا سے کہا:

"عصمت! تم نے ان نوجوانوں کو کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔" آپا اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

"اے ہے اب بولیں... میں نے کب منع کیا ہے انھیں۔"

۱۹۹۰ء کی بات ہے... میں مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا ممبر تھا۔ سردار جعفری ورکنگ چیئرمین اور یوسف ناظم ممبر سکریٹری تھے۔ میں نے ایک میٹنگ میں محفل افسانہ کی تجویز رکھی جو منظور ہو گئی۔ جلسے کی ذمہ داری بھی مجھی کو سونپی گئی۔ صدارت کے لیے عصمت آپا کا نام تجویز ہوا۔ جعفری صاحب نے مجھ سے کہا۔

"آج کل ان کی طبیعت کچھ ناساز رہتی ہے۔ اگر وہ آمادہ ہو جائیں تو ضرور لے آؤ۔"

دوسرے دن میں نے انھیں فون کیا۔ فون آپا نے ہی اٹھایا۔ میں نے مختصراً پروگرام کے بارے میں بتایا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

چار بجے کا وقت طے ہوا۔ میں ٹھیک چار بجے ان کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھیں مجھے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "کانچ کا بازی گر"۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے افسانہ نگار شفق سمجھ رہی ہیں... انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں شفق کے افسانہ 'کانچ کا بازیگر' اور سریندر پرکاش کے 'بجوکا' پر اپنی پسندیدگی کی مہر لگائی تھی۔ جدید اور نئے لکھنے والوں کے غالباً انھیں یہی دو افسانوں کے نام یاد تھے... میں آداب کر کے صوفے پر بیٹھ گیا اور کہا۔ "آپا! میں سلام بن رزاق ہوں 'کانچ کا بازیگر' شفق کا افسانہ ہے۔"

ہوگا بھی... اب نام یاد نہیں رہتے تم بھی تو افسانہ لکھتے ہو۔ ابھی چند روز پہلے میں نے اپنے ایک انٹرویو میں تمہارا ذکر کیا ہے۔ (یہ انٹرویو ڈاکٹر شیخ افروز زیدی نے لیا تھا اور آپا کی موت کے بعد شائع ہوا تھا غالباً یہ ان کا آخری انٹرویو تھا۔) "تمہاری کوئی کتاب نہیں چھپی؟"

میں نے کہا... "آپا میری دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ایک آپ کے لیے لایا ہوں۔"

میں نے اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ معبر انھیں پیش کیا۔

"یہ آپ نئے لوگ افسانوں کے نام خوب رکھتے ہیں۔ کانچ کا بازیگر، بجوکا... معبر..."

کتاب کو ادھر ادھر الٹ پلٹ کر دیکھا، اور ایک طرف رکھتی ہوئی بولیں۔

"اب پڑھا نہیں... ہوتا... مگر تمہاری کتاب پڑھوں گی... اچھا اس میں سب سے اچھا افسانہ کون سا ہے"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپا میں کیسے بتاؤں... یہ تو آپ بتائیں گی۔"

لبی ہوں... بھری۔ پھر گردن ہلا کر پوچھا۔ "کیا پروگرام لے کر آئے ہو؟"

میں نے محفل افسانہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "اس میں ممبئی کے چند افسانہ نگار اپنے افسانے پڑھیں گے اور آپ کی صدارت ہوگی۔ آپ کا نام بطور خاص جعفری صاحب نے تجویز کیا ہے۔"

"آج کل میں کہیں آتی جاتی نہیں۔ جلسہ کہاں ہے؟ اگر دور ہوا تو نہیں آؤں گی۔" میں نے کہا "جلسہ انجمن اسلام کے اکبر پیر بھائی ہال میں ہے۔ میں آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے" پھر انھوں نے اپنی ملازمہ سے چائے بنانے کے لیے کہا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ اکیلی رہتی ہیں؟"

"اکیلی کہاں... یہ رہتی ہے نا میرے ساتھ میری کیئر ٹیکر... یہ میرے سر کی مالش سے لے کر مساج تک سب کام کرتی ہے۔" انھوں نے اپنی ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ مضبوط ہاتھ پاؤں اور اچھے قد کاٹھی کی ایک سیاہ فام خاتون تھی۔ عمر چالیس پینتالیس کے قریب رہی ہوگی۔ ناک معمولی مگر چہرے پر مردوں جیسی کرختگی تھی۔ اسے دیکھ کر جانے کیوں مجھے ان کے افسانوں کے کتنے ہی کردار یاد آ گئے۔ 'ننھی کی نانی' کی گنگا بائی اور رتی بائی گھر والی کی لاجو، 'لحاف' کی 'ربو' چوتھی کی جوڑی کی عالیہ، گیندا کی گیندا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے ان کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا کیسی ہیں۔

"کوئی مصروفیت نہیں... بس گھر میں بیٹھی تاش کھیلتی رہتی ہوں۔"

"تاش کھیلتی ہیں کس کے ساتھ؟"

"اکیلی کھیلتی ہوں۔"

"اکیلے...؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"اور کیا... سامنے تکیہ رکھ دیتی ہوں اسی کو پارٹنر تصور کرتی ہوں اور کھیلتی ہوں۔"

میں نے آپا کو غور سے دیکھا۔ مجھے ان کی بوڑھی آنکھوں سے ایک ننھی منی کھلنڈری لڑکی جھانکتی نظر آئی... پرانی داستان کی ایک شہزادی کا قصہ بھی یاد آیا جو تنہائی میں اکیلی بیٹھی شطرنج کھیلا کرتی تھی۔ آپا آگے کہہ رہی تھیں۔

"تاش کھیلتے کھیلتے تھک جاتی ہوں تو ٹی وی دیکھنے لگتی ہوں۔" انھوں نے سامنے رکھے ہوئے ٹی وی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں جب ان سے رخصت ہو کر باہر آیا تو مجھے ماضی میں ان کی بیباکی اور حاضر جوابی کے کتنے ہی قصے یاد آئے جو جستہ جستہ رسالوں اور کتابوں میں نظروں سے گزرے تھے۔ انھوں نے منٹو جیسے بیباک افسانہ نگار کو زچ کر دیا تھا۔ میں کس شمار قطار میں تھا۔ مذکورہ محفل افسانہ میں وہ آئیں۔ سب کے افسانے سنے اور صدارتی تقریر بھی کی مگر ان کی تقریر میں کوئی ربط نہیں تھا۔ وہ وہاں پڑھے گئے افسانوں پر اظہار خیال کرنے کی بجائے اپنے ماضی کے ادھورے قصے سناتی رہیں۔ ان کی یادداشت پر ان کی عمر کا سایہ پڑ چکا تھا اور وہ بار بار فراموش کاری کی دھند میں کھو جاتی تھیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو عصمت آپا کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنے آخری ایام میں ایک جگہ لکھا ہے "مرنے کے بعد مجھے سمندر میں پھینک دیا جائے تاکہ مچھلیوں کے پیٹ میں کانٹا بن جاؤں اور کسی بہت زیادہ بھاشن دینے والے کے حلق میں پھنس کر کسی کار نیک کا باعث بن سکوں۔"

اگرچہ مرنے کے بعد سمندر میں پھینک دیے جانے کی خواہش غالب نے بھی کی تھی۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غالب غالباً اپنی کسی نامعلوم رسوائی سے بچنے کے لیے غرق دریا ہونا چاہتے تھے جب کہ عصمت آپا مر کر بھی کسی بھاشن دینے والے کے حلق میں پھنس کر اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی تھیں۔ مرنے کے بعد انھیں سمندر میں بہایا نہیں گیا...

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دُنیا

مہاراشٹر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ

ممبئی (۸ ستمبر)۔ ریاست مہاراشٹر ملک کی واحد ریاست ہے جہاں سب سے زیادہ اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں شعراء، ادباء اور اردو بولنے والے بھی اس ریاست میں موجود ہیں۔ اسی لیے ہماری کوشش ہوگی کہ اگر ریاست میں کانگریس برسرِ اقتدار آئی تو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا۔ یہ اعلان آج یہاں اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خاں نے ممبئی کے انجمن اسلام میں منعقدہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے سال ۲۰۱۳ء کے جلسۂ تقسیم انعامات سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ نسیم خاں نے مزید کہا کہ ریاست کی اردو اکیڈمی ملک کی سب سے فعال اکیڈمی بن چکی ہے جب کہ جب یہ قلمدان وزارت اقلیتی بہبود کے ماتحت آیا تو اس کا سالانہ بجٹ محض بیس لاکھ روپے تھا لیکن ان کی کوششوں اور وزیرِ اعلیٰ پرتھوی راج چوہان کی فراخ دل حمایتوں کے نتیجے میں آج اردو اکیڈمی کا بجٹ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی وزارت نے امسال کے بجٹ میں دو کروڑ کی تجویز بھی حکومت کو بھیجی ہے۔ ریاستی سرکاری زبان مراٹھی اور اردو کے تعلق سے بولتے ہوئے نسیم خاں نے کہا کہ اردو اکیڈمی کی سرگرمیاں بہت ہیں اور اس زبان کے ذریعے مراٹھی زبان کو بھی قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وزیرِ اعلیٰ پرتھوی راج چوہان نے ہمیشہ اردو ادب کے فروغ کے لیے فکرمندی دکھائی ہے، اس لیے، آج اکیڈمی پورے وسعت سے ریاست بھر میں کام کر رہی ہے۔ نسیم خاں نے اردو کے مختلف اوصاف بھی بیان کیے اور کہا کہ ملک کے تقریباً ہر باشندے اپنی عام فہم زبان میں اردو کا استعمال کرتے ہیں اور ملک میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ تقریب کے آغاز میں اکیڈمی کے جوائنٹ سکریٹری فاروق انصاری نے کہا کہ مہاراشٹر اردو زبان و ادب کا گہوارہ ہے اور اردو اکیڈمی کے ذریعے اس زبان کو فروغ دینے کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ فاروق صاحب نے مزید کہا کہ جب سے اردو اکیڈمی اقلیتی امور کی وزارت کے ماتحت آئی ہے تب سے اکیڈمی کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔

(آئی۔ لکھنؤ)

تلنگانہ کے سبھی ضلع کلکٹریٹ دفاتر میں اردو سیل قائم ہو

حیدرآباد (۲۰ ستمبر)۔ تلنگانہ کے تمام اضلاع میں کلکٹریٹ حیدرآباد کی طرز پر اردو سیل کا قیام بے حد ضروری ہے تاکہ اردو زبان کے مسائل، اردو درخواستوں کی وصولی اور اقلیتوں کے دیگر مسائل کو اردو سیل سے رجوع کرنے پر انھیں حل کیا جا سکے۔ تلنگانہ کے سبھی ضلع دفتر کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ میں اردو مترجمین کا بھی تقرر ضروری ہے خاص طور پر اردو اخبارات میں مسلمانوں اور اردو کے مسائل سے متعلق شائع خبروں پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوتا جس کی بڑی وجہ ضلعی دفتر میں اردو سیل اور مترجم کا نہ ہونا ہے۔ ہم تلنگانہ کے چیف منسٹر و ڈپٹی چیف منسٹر اور محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر اس تعلق سے سنجیدگی سے غور کریں اور اردو کا ایک علاحدہ سیل قائم کریں جو ہر ضلع کے کلکٹر آفس میں کارکرد ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آندھرا پردیش حکومت کی طرح تلنگانہ حکومت اردو سے بیر نہیں رکھے گی بلکہ اردو سے انصاف کرے گی۔

(سید سمیع الدین۔ حیدرآباد)

ریاستی حکومت سے اردو اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ

گورکھپور (۹ ستمبر)۔ پرائمری اسکولوں میں حکومت اترپردیش کو ڈائرکٹر آف بیسک ایجوکیشن کے ذریعے دی گئی تجویز کے سلسلے میں فوری عملی جامہ پہنانے کے لیے جس کے تحت گزشتہ ماہ 4280 اردو اساتذہ کے عہدے پر دیے گئے اشتہار کے مطابق چوتھی کونسلنگ کرانے اور باقی 3520 عہدوں کو دوبارہ دیے گئے اشتہار میں شامل کرنے اور سرکاری اسکولوں میں اردو کتابیں دستیاب کرانے سمیت کئی مطالبات کو پورا کرانے کے سلسلے میں معلم اردو ایسوسی ایشن کے عہدیداران کا ایک جلسہ صوبائی صدر کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا جس کی صدارت ایسوسی ایشن کے صوبائی صدر حسام الدین صدیقی نے کی۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے حسام الدین صدیقی نے کہا کہ مرکزی حکومت نے ۱۱۔۲۰۱۰ء میں پرائمری تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے اترپردیش حکومت کو 80 ہزار اساتذہ کی تقرری کی منظوری دی۔ اس کے تحت موجودہ حکومت نے 72 ہزار 825 اساتذہ کی تقرری کی کارروائی شروع کر دی لیکن باقی اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے اشتہار تو جاری کر دیا لیکن سازش کے تحت حکومت نے صرف دو ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کر دی اور باقی اساتذہ کو عدالت جانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ساڑھے سات ہزار اردو اساتذہ کی تقرری فوری طور سے کی جائے اور چوتھی کونسلنگ جلد سے جلد شروع کی جائے۔

(آئی۔ لکھنؤ)

اردو میڈیم گرلز جونیئر کالج جگتیال کی طالبات کی رکن اسمبلی سے نمائندگی

جگتیال (۲۰ ستمبر)۔ اردو میڈیم گرلز کالج جگتیال کی طالبات نے لیکچرر عالیہ منصور اور محمد متعول (کانگریس قائد) کی قیادت میں رکن اسمبلی جگتیال اور ڈپٹی فلور لیڈر کانگریس جناب ٹی جیون ریڈی کی رہائش گاہ پہنچ کر ایک یادداشت ان کے حوالے کیا۔ اس موقعے پر طالبات نے گرلز جونیئر کالج میں درپیش مسائل سے رکن اسمبلی کو واقف کروایا۔ انھوں نے بتایا کہ جونیئر کالج اردو میڈیم میں 250 طالبات زیر تعلیم ہیں۔ کالج کی عمارت خستہ حال ہے جہاں کوئی سہولت مہیا نہیں ہے۔ رکن اسمبلی نے ان مسائل کو سماعت کرتے ہوئے اندرون ایک ہفتہ کالج میں پینے کے پانی کا انتظام، بیت الخلا کی تعمیر، سٹنگ فنس، انفراسٹرکچر فراہم کرنے کے علاوہ کالج میں صاف صفائی کروانے کا یقین دلایا۔ انھوں نے کل بلدیہ عملے کے ساتھ کالج کا دورہ کرتے ہوئے تفصیلات حاصل کرنے اور تمام مسائل کے حل کا یقین دلایا۔ اس موقعے پر محمد سراج الدین منصور، کونسلر محمد عبدالباری مجاہد، محمد متعول، دیویندر ریڈی اور دیگر موجود تھے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ایم ایل بی گرلز کالج سے اردو اور عربی کی تعلیم بند کرنے کا فرمان

انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش نے اسے اردو دشمنی قرار دیا

بھوپال۔ محکمۂ اعلیٰ تعلیم کے ذریعے ۳ جون ۲۰۱۳ء کو جاری آرڈر کے مطابق ایم ایل بی کالج میں اردو اور عربی کلاسز میں داخلے بند کر کے انھیں حمیدیہ آرٹس کامرس کالج اور گورنمنٹ گیتانجلی کالج شفٹ کر دیا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق اس سلسلے میں ایم ایل بی کالج کی ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف اردو کو باضابطہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اردو کورس میں داخلہ نہ لیں۔ وزیرِ اعلیٰ شیوراج سنگھ چوہان نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد خواتین اور لڑکیوں کے تحفظ کو خاطر خواہ ترجیح دے رکھی ہے لیکن انھی کی حکومت میں محکمۂ اعلیٰ تعلیم کے ذریعے لڑکیوں کو تعلیم کے لیے لڑکوں کے کالج یا شہر کے آخری سرے پر واقع ایک کالج میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فرمان چلانے والا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایم ایل بی کالج سے اردو کورسز کی تعلیم کو بتدریج ختم کرنے کی ایک سازش رچی گئی ہے جس پر محکمۂ اعلیٰ تعلیم نے عمل شروع کر دیا ہے۔ عوامی اور تعلیمی شعبے سے تو اس سلسلے میں احتجاجی آوازیں بلند ہو رہی ہیں لیکن سیاسی سطح پر خاموشی ہے۔ کانگریس قائدین کو تو اردو یا اقلیتوں سے کوئی سروکار نہیں رہ گیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ پردیش میں برسرِ اقتدار بی جے پی کے قائدین بالخصوص بھاجپا کی مدھ سرائی میں زمین آسمان ایک کرنے والے عارف بیگ جیسے لیڈران کچھ بولتے ہیں کہ نہیں؟

ادھر اشا ایم ایل بی گرلس کالج سے محکمۂ اعلیٰ تعلیم کے ذریعے اردو درجات کو ختم کرنے کے حکم پر پروفیسر آفاق احمد نے سخت احتجاج کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کے صدر پروفیسر آفاق نے اپنے ایک مراسلے میں کہا کہ یہاں پر اس کالج کے قیام (1956) سے اردو درجات قائم تھے اور بعد میں 1976 میں ایم اے کلاسز بھی کھولے گئے۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس کالج کی ایک عظیم تاریخ ہے اور اردو اس تاریخ کا حصہ ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو 1960 میں اس کالج میں تشریف لائے تھے اور تہذیبی پروگرام دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور کالج کی وزیٹرس بک پر لکھا:

"مجھے یہاں آج آ کر خوشی ہوئی لڑکیوں کو پیار اور آشیرواد"۔

قابلِ غور طلب ہے کہ ایم ایل بی کالج کے اردو سیمینار اور طالبات کی کارکردگی کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اردو کے تمام بڑے شاعر اور ادیب یہاں تشریف لائے ہیں جن میں بعض بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ ان میں فیض احمد فیض جیسا شاعر اور سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، عصمت چغتائی، مجروح سلطانپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، خواجہ احمد فاروقی، معین احسن جذبی، جگن ناتھ آزاد جیسے چوٹی کے اردو ادیب و شاعر شامل ہیں۔ سردار جعفری اور قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے جب کہ جعفری صاحب، قرۃ العین حیدر صاحبہ، جذبی صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب، عصمت چغتائی اور مجروح سلطانپوری ہمارے صوبے کے محکمۂ ثقافت کے باوقار اعزاز اقبال سمان سے نوازے جا چکے ہیں۔ اس کالج نے بہت سی ایسی طالبات پیدا کی ہیں جنھوں نے پی ایچ ڈی کے قابلِ قدر تحقیقی مقالے لکھے اور بہ حیثیت تخلیق کار اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کرایا۔

آج بھی ایم ایل بی کالج میں بھوپال کے کسی بھی سرکاری کالج کے مقابلے میں اردو میں سب سے زیادہ طالبات ہیں، جس کا ریکارڈ دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل اردو اور اس کے ساتھ عربی کو بھی اس کالج سے دور کر کے پرانے شہر کی لڑکیوں سے ان کا حصولِ تعلیم کا حق چھینا جا رہا ہے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ وزیرِ اعلیٰ تعلیم اس ناانصافی کا تدارک کریں اور ایم ایل بی کالج میں اردو کے درجات بدستور قائم رکھ کر طالبات اور اہلِ اردو کی خیرسگالی حاصل کریں۔

(ندیم۔ بھوپال)

27 ہزار اردو اساتذہ سمیت سوا لاکھ ٹیچروں کی بحالی

نومبر میں 75 ہزار پرائمری اساتذہ کی بحالی کا عمل شروع ہوگا

سب سے پہلے اکتوبر میں اردو اساتذہ کی بحالی ہوگی

پٹنہ (۹ر ستمبر)۔ ٹیچر بننے کے خواہشمند طلبہ اور طالبات کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ ریاست میں تقریباً سوا لاکھ اساتذہ کی جلد بحالی ہونے والی ہے۔ ان میں سے 75 ہزار پرائمری ٹیچر اور 27 ہزار اردو کے اساتذہ شامل ہوں گے۔ اردو ٹیچروں کے ساتھ ہی موسیقی اور دستکاری مضمون کے تقریباً 3 ہزار اساتذہ بھی بحال ہوں گے۔ اس کے علاوہ پنچایتوں میں ایک ہزار مڈل اسکول میں تقریباً 22 ہزار اساتذہ کی ایک ساتھ بحالی کی جائے گی۔ اس کے لیے ریاستی سرکار کے ذریعے ساری تیاریاں پوری کی جا رہی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ پہلے سے ریاستی سرکار کے ذریعے مجوزہ ٹیچر تقرری میں 50 فیصد خواتین کو ریزرویشن کا فائدہ بھی خواتین کو ملے گا۔ اس کے علاوہ معذور امیدواروں کو بھی ریزرویشن کا فائدہ دیا جائے گا۔

محکمہ تعلیم کی تیاریوں پر غور کریں تو سب سے پہلے اکتوبر میں اردو اساتذہ کی بحالی ہوگی۔ اس کے لیے گزشتہ سال ہی محکمہ تعلیم نے اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے خصوصی ٹی ای ٹی کا امتحان لیا تھا، مگر ریزلٹ آنے کے ایک سال بعد اب تک ان کامیاب ٹی ای ٹی امیدواروں کی بحالی نہیں کی گئی۔ وزیر تعلیم ورشن پٹیل کی اجازت کے بعد محکمہ تعلیم کی طرف سے اردو اساتذہ کی بحالی کے لیے شیڈول کو حتمی شکل دی جارہی ہے۔ اس مہینے کے آخر تک شیڈول کو جاری کرنے کی تیاری ہے۔ اردو اساتذہ کی تقرری کا کام ایک مہینہ چلنے کی امید ہے۔ اس تقرری کے عمل کو کس طرح سے کم وقت میں پورا کیا جائے اس پر بھی محکمہ تعلیم غور کر رہا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

ضلع کڑپہ (آندھرا پردیش) میں اردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان

کڑپہ، آندھرا پردیش (۵ر ستمبر)۔ آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے ضلع کڑپہ کے قائدین اور عوام یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ اب ضلع سے ترقیاتی کاموں میں تعصب سے کام لیا جائے گا کیوں کہ یہ ضلع وائی ایس آر کانگریس پارٹی کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ یہاں سے 10 کے منجملہ 9 حلقوں سے وائی ایس آر کانگریس پارٹی کے اراکین اسمبلی منتخب ہوئے ہیں جب کہ تیلگو دیشم کے صرف ایک رکن اسمبلی کو ہی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایسے میں گزشتہ روز چیف منسٹر چندرا بابو نائیڈو نے وجے واڑہ کو آندھرا پردیش کا کیپٹل بنانے کا اعلان کیا، ساتھ ہی مختلف اضلاع کو دیے جانے والے ترقیاتی پروجیکٹس کا بھی اعلان کیا جس میں ضلع کڑپہ میں ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کا اعلان بھی شامل ہے۔ ان کے اس اعلان سے ضلع کڑپہ کے اردو داں طبقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ضلع کڑپہ میں اردو یونیورسٹی کے قیام سے نہ صرف علاقہ بلکہ ریاست آندھرا پردیش کے بھی اردو داں افراد ضلع کڑپہ میں اردو یونیورسٹی سے استفادہ کرسکیں گے۔ علاقہ رائلسیما و آندھرا میں سب سے زیادہ اردو داں افراد ضلع کڑپہ میں ہی بستے ہیں۔ یہ اعلان اردو والوں کے لیے فال نیک قرار دیا جا رہا ہے۔ ضلع کڑپہ میں اردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کی کافی تعداد ہے۔ ضلع کڑپہ میں 242 اردو ایلیمنٹری اسکولس، 30 اپر پرائمری اسکولس اور 27 ہائی اسکولس اور 3 اردو جونیئر کالجس قائم ہیں۔ اس کے علاوہ ضلع میں اقلیتوں کا ایک میڈیکل کالج فاطمہ میڈیکل کالج، ایک اقلیتی انجینئرنگ کالج، مدینہ انجینئرنگ کالج ہیں۔ اب کڑپہ میں اردو یونیورسٹی کے قیام سے یہاں کے اقلیتوں میں کافی مسرت پائی جاتی ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ضلع میدک کے لیے 119 اردو میڈیم انسٹرکٹرس منظور

سنگاریڈی (۳۰ر اگست)۔ جناب ایم اے سلام (سابق اسپیشل آفیسر کستوربا گاندھی گرلز اردو میڈیم اقامتی ہائی اسکول سنگاریڈی) نے اپنے پریس نوٹ میں بتایا کہ تلنگانہ حکومت نے ریاست تلنگانہ کے سات اضلاع کے اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی خالی اسامیوں پر اکیڈمک انسٹرکٹرس (ودیا والینٹرس) کے تقرر کا فیصلہ کرتے ہوئے احکام جاری کیے ہیں، جس کے مطابق ضلع میدک کے لیے 119 اردو میڈیم اکیڈمک انسٹرکٹرس منظور کیے گئے، جو ضلع رنگاریڈی کے بعد تلنگانہ ریاست میں دوسرے نمبر پر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل، اساتذہ کی قلت اور اکیڈمک انسٹرکٹرس کی منظوری جیسے مسائل پر جناب اے اے قادر فیصل (صدر تلنگانہ یونین آف ورکنگ جرنلسٹ ضلع میدک و ممبر اگزیکیٹو کونسل عثمانیہ یونیورسٹی) نے تعلیمی سال کے آغاز کے فوری بعد ۶ر جولائی کو پرنسپل سکریٹری تعلیمات، کمشنر تعلیمات کے علاوہ منسٹر ہریش راؤ (ریاستی وزیر آب پاشی) سے ملاقات کرتے ہوئے ایک جامع تحریری نمائندگی کی تھی جس پر ٹی ہریش راؤ نے کمشنر تعلیمات کو فوری کارروائی کی ہدایت دی تھی، جس کے بعد کمشنر محکمہ تعلیمات نے پروجیکٹ آفیسر سروشکشا ابھیان ضلع میدک سے اس خصوص میں رپورٹ طلب کی۔ محترمہ شیخ یاسمین باشاہ (پروجیکٹ آفیسر سروشکشا ابھیان ضلع میدک) نے مکتوب نمبر 363/B3/TSSA/2014 مورخہ ۸ر جولائی روانہ کرتے ہوئے مجموعی طور پر 255 اردو میڈیم اکیڈمک انسٹرکٹرس منظور کرنے کی خواہش کرتے ہوئے رپورٹ روانہ کی۔ واضح ہو کہ گزشتہ تعلیمی سال کے دوران جناب قادر فیصل کی کاوشوں سے 201 اکیڈمک انسٹرکٹرس پوسٹ منظور ہوئے تھے۔ اس سال محکمہ تعلیمات نے انتہائی قلیل تعداد میں اکیڈمک انسٹرکٹرس پوسٹ منظور کیے، جو کسی بھی زاویے سے ضلع میدک کے لیے ناکافی ہیں۔ اس لیے محکمہ تعلیمات فوری مزید 140 اردو اکیڈمک انسٹرکٹرس کے پوسٹ منظور کرے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

یوم اساتذہ کے موقعے پر
اردو اساتذہ
حکومت کے ایوارڈس سے محروم

بیدر، کرناٹک (۷ر ستمبر)۔ نوجوان سوشل ورکر اور صدر بیدر اولمپک اسوسی ایشن جناب محمد فرحت خاں عرف عرفان پٹھان نے ایک پریس نوٹ جاری کرکے بتایا ہے کہ یوم اساتذہ کے موقعے پر ریاستی حکومت نے جملہ 30 اساتذہ کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے جن میں 20 پرائمری اسکول اور 10 ہائی اسکول سے تعلق رکھنے والے اساتذہ ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان 30 اساتذہ میں سے کوئی ایک معلم بھی اردو اسکول سے تعلق نہیں رکھتا۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ حکومت کی نظر میں اردو اساتذہ کا کوئی مقام نہیں ہے یا پھر یہ سمجھا جائے کہ اردو اساتذہ نیند میں ہیں، انھیں حکومتی انعامات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

کمرہٹی گرلس اردو ہائی اسکول کو شروع کرنے کا مطالبہ

کمرہٹی۔ گزشتہ دنوں انجمن ترقی اردو (کمرہٹی شاخ) کی تحریک پر کمرہٹی یونین کالجیٹ جونیئر ہائی اسکول میں اہل علم، اساتذۂ کرام اور وارڈ کونسلروں کی ایک مشاورتی میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت ریاستی انجمن کے سکریٹری ماسٹر سراج الدین نے فرمائی جب کہ مقامی شاخ کے سکریٹری ماسٹر محمد فہیم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ میٹنگ میں علاقے کے تعلیمی مسائل اور ان کے حل کے لیے تجاویز اور مشورے پیش کیے گئے۔ ماسٹر سراج الدین نے میٹنگ کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے گزشتہ ہفتہ کمرہٹی میونسپلٹی کے چیئرمین شری گوپال ساہا سے انجمن کمرہٹی کے وفد کی ملاقات میں ہوئی گفتگو کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ میونسپلٹی کی مالی اعانت سے مہاتی میدان میں گرلس اردو ہائی اسکول کی عمارت تقریباً تیار ہوچکی ہے، لہٰذا اس اسکول میں آئندہ تعلیمی سال ۲۰۱۵ء سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرنا انتہائی ضروری ہے تاکہ علاقے کے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکے اور طالبات کو بھی داخلے کے مسائل سے نجات مل سکے۔

مشاورتی میٹنگ میں شریک وارڈ کونسلر نظام الدین انصاری، کونسلر کانوکی چٹرجی، کونسلر محمد حسام الدین اور کونسلر حسن کمال سمیت کمرہٹی ہائی اسکول کے ٹیچر انچارج ماسٹر امجد حسین انصاری، ماسٹر محمد فیروز خاں، مسلمہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اسلم علی اور ماسٹر مسیح احمد، سماجی ورکر محمد پرویز احمد انجینئر، شاعر و علی عمر اور ماسٹر قیام الدین وغیرہ نے بھی مذکورہ اسکول کو فی الفور شروع کرنے کی بھرپور تائید کی۔

میٹنگ میں شریک کونسلر حضرات نے یہ خوش خبری دی کہ آئندہ ماہ کمرہٹی میں ICDS مراکز مزید قائم کیے جائیں گے، جہاں اردو استانیاں بچوں کو اردو زبان میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیں گی، جس کے لیے بحالی کا عمل جلد شروع ہونے کی امید ہے۔ میٹنگ میں اردو گرلس ہائی اسکول کو نئے تعلیمی سال سے شروع کرنے اور سرکاری منظوری حاصل کرنے کے تعلق سے مقامی ممبر پارلیمنٹ سوگت رائے اور ممبر اسمبلی مدن مترا سے ملاقات کرکے گفتگو کرنے پر بھی اتفاق ہوا۔

(اخبار مشرق۔ کلکتہ)

تلنگانہ کے سرکاری اسکولوں میں ٹیچروں کی کمی

اردو میڈیم اسکولوں کی صورت حال مزید ابتر

حیدرآباد (۶ر ستمبر)۔ پورے ملک کے ساتھ تلنگانہ میں بھی 'یوم اساتذہ' جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ اسکولوں میں طلبہ کی جانب سے ٹیچروں کو تہنیت پیش کی گئی نیز حکومت اور بعض غیر سرکاری تنظیموں کی جانب سے بہترین ٹیچروں کو ایوارڈس بھی پیش کیے گئے لیکن سرکاری مدارس میں ٹیچروں کی قلت پر نہ کسی نے توجہ دی اور نہ ہی کسی نے اس کا تذکرہ کیا۔ سرکاری ذرائع کے مطابق اس وقت سرکاری پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں ٹیچروں کی 2400 سے زائد اسامیاں خالی ہیں۔ تلنگانہ میں بچوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیم ایم وی فاؤنڈیشن کے کوآرڈینیٹر راجندر پرساد سرکاری مدارس میں ٹیچر کی قلت کے لیے حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ دیرینہ ہے جس پر حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی۔ محض ٹیچروں کی خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے کوئی اقدام ہی نہیں کیے جاتے جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہر سال خالی ہونے والی ٹیچروں کی اسامیوں کو باقاعدگی کے ساتھ پُر کیا جائے۔ مسٹر راجندر پرساد نے بتایا کہ ٹیچروں کی خالی اسامیوں پر آخری بار ۲۰۱۲ء میں تقرر کیا گیا تھا لیکن پچھلے دو سالوں میں ایک بھی تقرر نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ سال جب سرکاری مدارس میں ٹیچروں کی شدید قلت ہوگئی تھی تو اس وقت کی حکومت نے بحران سے نمٹنے کے لیے کم سے کم ایس ایس سی، انٹرمیڈیٹ پاس امیدواروں کو عارضی طور پر بحیثیت ٹیچر تقرر کیا تھا جس کے نتیجے میں طلبہ کو کافی مشکلات پیش آئیں۔ اس کے بعد طلبہ اور دیگر قابلیت کے اہل ٹیچروں کے مسلسل مطالبے پر حکومت ٹیچروں کے تقرر کا اعلامیہ جاری کرنے پر آمادہ ہوئی ہے جو کسی بھی دن جاری ہوسکتا ہے لیکن اعلامیہ جاری کیے جانے کے بعد تقرر کا عمل مکمل ہونے میں کم سے کم تین تا چار ماہ کا عرصہ درکار ہوگا اور اس کی وجہ سے طلبہ کو جاریہ تعلیمی سال میں بھی کافی دقتیں پیش آئیں گی۔ جہاں تلنگانہ کے مواضعات اور اضلاع ٹیچروں کی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : نامی انصاری فن اور شخصیت
مرتب : جاوید ہاشم
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۱۸۴ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ماڈرن بک ڈپو، بکن گنج کان پور، یوپی
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razakidak@gmail.com

اردو زبان و ادب میں ایسے خوش قسمت کم ہی ہوتے ہیں جن کے انتقال کے فوراً بعد ان کو تخلیقی خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کوئی کتاب منظر عام پر آئے وہ بھی نامی انصاری جیسے منفرد نقاد اور شاعر کے لیے، جن کا تعلق کسی گروپ سے نہیں تھا، وہ تن تنہا ادب کی مشعل کو روشن رکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے بیٹے جاوید ہاشم اور محمد محمود ہاشم کی مرتب کردہ تازہ ترین کتاب ہے جس میں بڑے ہی سلیقے سے کوزے میں سمندر کو بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بہر حال اچھی کوشش ہے۔ کتاب میں سب سے پہلے 'نقوش حیات' کے عنوان سے نامی انصاری کے کوائف اور ادبی سرگرمیوں اور تخلیقی کوششوں کی فہرست شامل کی گئی ہے۔ اس کے بعد 'مشاہیر کی نظر میں' کے عنوان سے چند معتبر ادیبوں اور نقادوں کے نامی انصاری سے متعلق رائے کے اقتباس شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کو ذیلی طور پر تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ جس میں پہلے حصے کا عنوان شخصیت ہے جس کے تحت سات تخلیقات شامل ہیں جس میں جمیل قدوائی کے قطعات اور نظم میں نامی انصاری کو منظوم خراج عقیدت پیش کی گئی ہے، اس کے علاوہ ظفر احمد نظامی کا خاکہ، مجتبیٰ حسین کی طنز و مزاح نگاری، عشرت ظفر کے مضمون، فاروق ارگلی کے مضمون اور تسکین زیدی کے مضمون کے علاوہ جاوید ہاشم کا تاثراتی مضمون بھی شامل ہے جس میں نامی انصاری کی شخصیت کے حوالے سے بھرپور تفصیل موجود ہے۔

دوسرے ذیلی عنوان تنقید میں نامی انصاری کی ادبی کاوشوں اور کوششوں کو ۱۵ ناقدین کے مضامین کے ذریعے پرکھنے کی کوشش ہے، اس میں ڈاکٹر انور سدید نے نامی انصاری کا تنقیدی زاویہ نظر، یوسف ناظم کا مضمون بیسویں صدی میں طنز و مزاح ایک طائرانہ نظر، فاروق جائسی کا مضمون نامی انصاری کی مضمون نگاری، ڈاکٹر خان حفیظ کا مضمون نامی انصاری کی ناقدانہ حیثیت، ڈاکٹر نعیمہ جائسی کا مضمون 'ادبی گلیارے کا ایک نام نامی' خصوصی حیثیت کے حامل ہیں جس میں نامی انصاری کی تنقید نگاری، مضمون نگاری اور ناقدانہ حیثیت کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

تیسرے ذیلی عنوان 'شاعری' میں آٹھ مضامین شامل ہیں جس میں نامی انصاری کو بہ حیثیت شاعر جانچنے، پرکھنے اور ادبی میزان پر ان کی شعری بصیرت کا محاسبہ کرتے ہیں جس میں شارب ردولوی کا مضمون نامی انصاری: ایک خوش گو شاعر، یوسف ناظم کا مضمون ایک الگ کینڈے کا شاعر: نامی انصاری، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کا مضمون باتیں چند، ڈاکٹر سعید عارفی کا مضمون غزل کا ہفت رنگ شاعر خصوصیت کے حامل ہیں، اس کے علاوہ عشرت ظفر، ارمان نجمی، منظر اعجاز اور ڈاکٹر خان احمد فاروق کے مضامین بھی قابل تعریف ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نامی انصاری جیسی شخصیت کے لیے یہ کتاب بلاشبہ ایک اچھی کوشش ہے لیکن نامی انصاری کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے جتنا کام ہونا چاہیے وہ عصر حاضر کے ادیبوں اور ناقدین پر ان کا قرض ہے جس کا متقاضی نامی انصاری کے فن پارے ہیں۔ نامی انصاری ادبی گروپ بندی سے الگ ایک منفرد مزاج رکھتے تھے اس لیے ان کی ادبی حیثیت کو لگا ہے یہ کام نئی نسل تک پہنچانے کے لیے ادبی کوششوں کا سلسلہ قائم رہنا چاہیے۔ امید کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں بلاشبہ قبولیت عام کی سند حاصل کرے گی۔

○○○

نام کتاب : عکس حنا
مصنف : لئیق خان کوثر کمال زئی
ضخامت : ۲۰۸ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : لئیق خان کوثر کمال زئی، ڈیرہ کمال زئی، تھانہ پا کھڑ، رام پور، یوپی
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah093@gmail.com

اردو دنیا میں رامپور، دہلی اور لکھنؤ کے بعد تیسرا اسکول ہے اس شہر کے علما، فضلا اور محققین نے علم و ادب، فلسفہ اور حکمت میں جو کارنامے انجام دیے ہیں اس کا اعتراف صرف فارسی اور عربی کے علما ہی نہیں کرتے بلکہ ہر اہل علم و فن کو اس کا اعتراف ہے۔ جس طرح بغداد کے اجڑنے کے بعد دہلی نے علما اور فضلا کی سرپرستی کی اسی طرح ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور نے شاعروں اور دانشوروں کو پناہ دی، اسی رامپور شہر سے کوثر تعلق رکھتے ہیں۔ کوثر نے رامپور کے ادبی اور شعری فضا میں آنکھیں کھولیں اور وہیں کی ادبی فضا میں رچ بس گئے۔ ۱۹۶۱ء سے اپنی شعری زندگی کا آغاز کیا اور ان کا پہلا مجموعہ کلام 'نشاط فن' کے نام سے شائع ہو کر قدر دانوں کے درمیان ایک مقام حاصل کیا۔

'عکس حنا' ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ وہ روایتی غزلوں کے شاعر ہیں مگر کہیں کہیں ان کی روایتی اور تقلیدی شاعری میں ان کے تجربات اور مشاہدات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ کوثر صاحب کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر شریف احمد قریشی لکھتے ہیں: ''کوثر صاحب کی غزلیات میں ایک خاص قسم کی جمالیاتی فضا اور سرشاری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے یہاں عشق و ہوس کی فضا گڈمڈ نہیں ہوتی۔ وہ عاشقانہ جذبات و احساسات کا اظہار نہایت سنجیدگی، شرافت اور مشرقی روایت کے احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق کسی سفلی جذبے کے روپ میں نہیں ابھرتا بلکہ ایک اعلا قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے اشعار میں معاملات حسن و عشق اور محبوب کی نہایت مہذب اور شائستہ تصاویر نظر آتی ہیں:

یاد ہے ان کی اور تنہائی
جی نہیں لگتا اب نظاروں میں

اف ان کے لب پہ تبسم کی شوخیاں
جیسے کوئی کلی ہو چمن میں کھلی ہوئی

جس طرح ان کی شاعری روایتی ہے اسی طرح ان کے یہاں روایتی الفاظ و استعارات کی فراوانی ہے اسی وجہ سے ان کے کلام میں کسی قسم کی پیچیدگی اور ابہام نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی علامت استعمال کی گئی ہے تو وہ بھی واضح ہے۔ اس مجموعے میں کلاسیکی استعارات اور علامتوں کو استعمال کر کے حالات حاضرہ کے مسائل کو بہت اچھی طرح پیش کیا ہے

مجھے وہ بھی زمانہ یاد ہے جب یہ چمن والے
جلا کرتے تھے شعلے دیکھ کر میرے نشیمن میں

شاعری کے علاوہ اس کتاب میں کچھ مضامین ہیں جس میں ایک مضمون صولت پبلک لائبریری پر بھی ہے۔ کوثر صاحب کا یہ مضمون ایک مکمل مضمون ہے جس میں انھوں نے صولت پبلک لائبریری کا ایک مختصر تعارف پیش کیا ہے کہ یہ لائبریری تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے آج کہاں پر قائم ہے، اس اعتبار سے یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طریقے کے کوثر صاحب کے اور دوسرے مضامین بھی ہیں۔

کتاب اپنی جلد اور طباعت کے لحاظ سے خوب صورت ہے۔ امید ہے اہل قدر کی نگاہوں میں مقبول ہوگی۔

○○○

بقیہ: عصمت چغتائی...

صفحہ ۳ سے آگے

بلکہ جلایا گیا... غالباً انھیں کی وصیت کے مطابق... ان کی یہ وصیت بھی روایت کے حلق کا کانٹا بن گئی۔ اردو دنیا میں ان کی وصیت کو لے کر عرصے تک چناں چنیں کا بازار گرم رہا۔ ان کی میت میں اردو کا کوئی ادیب شریک نہیں تھا، سردار جعفری ترقی پسند شاعر اور بے نیاز دین و مذہب بھی ان کی ارتھی یا جنازے میں شریک ہونے کی بجائے یہ کہتے ہوئے وہاں سے کھسک گئے کہ ''بھائی انھوں نے تو جلانے کی وصیت کی ہے۔''

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر عصمت آپا نے جلانے کی وصیت کیوں کی؟ کیا وہ قبر میں کیڑے مکوڑوں کی غذا بننے سے گھبراتی تھیں یا انھیں یہ ڈر تھا کہ اگر وہ پوری طرح مری نہیں اور انھیں قبر میں دفن کردیا گیا اور وہ قبر میں اچانک ہی اٹھیں تو کیا ہوگا... ایسی کیفیت کو انھوں نے اپنے ایک افسانے 'تھوڑی سی پگلی' میں بیان بھی کیا ہے... ''وہ مری نہیں تھی۔ مرجاتی تو اسے گلابی چارخانے کا فراک کیوں کر یاد آتا۔ اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی مگر اس کے سینے پر ایک بھاری سِل پڑی ہوئی تھی... پھر بھی وہ زور لگاتی رہی۔ وہ رینگ رینگ کر آگے کھسکتی رہی، پھر بے ہوش ہوگئی۔''

کیا بعد از مرگ قبر کی اس اندیش ناک زندگی کے تصور نے انھیں جلانے کی وصیت کرنے پر مجبور کردیا تھا؟ یا اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہوا وہ بے مثل خاکہ 'دوزخی' یاد آگیا تھا جس میں انھوں نے اپنے بھائی کو بستر مرگ پر دیکھ کر لکھا تھا ''وہ ایک مصیبت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا۔ وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس وہ تیکھی طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔''

یا پھر ہو سکتا ہے عمر کے آخری پڑاؤ پر انھیں خود اپنے ہی لکھے ہوئے ان جملوں کی تیزابیت کا احساس ہوا ہو اور اچانک ان کے دل میں بھائی کی محبت موجزن ہوئی ہو اور وہ بھی دوزخ میں پہنچ کر کہنا چاہتی ہوں۔

''لو عظیم بھائی! میں بھی آگئی۔''

انھوں نے زندگی بھر روایتوں سے انحراف کیا۔ وہ روایت کی ہر سیدھی لکیر کے آگے ایک 'ٹیڑھی لکیر' کھینچنے کی عادی تھیں۔ جلانے کی وصیت بھی کہیں ان کی اسی ضدی طبیعت اور ٹیڑھے پن کی غماز تو نہیں؟

جو بھی ہو... ممکن ہے آنے والے وقت میں لوگوں کو نہ ان کی زندگی کی روایت شکن باتیں یاد رہیں نہ ان کی موت کی وہ متنازع وصیت، لیکن ان کی لکھی ہوئی کہانیاں ہمیشہ زندہ رہیں گی، جب تک ہمارا ادب زندہ رہے گا۔

●●●

بقیہ: رازہائے درونِ پردہ

صفحہ ۸ سے آگے

اداکارہ وجے کے ساتھ برابر کی ہیروئن کا رول ادا کیا۔ موتی لال نے اس میں ہیرو کا کردار نبھایا تھا۔ میوزک انل بسواس کا تھا۔ اس فلم میں گلوکار مکیش نے اپنا پہلا نغمہ دل جلتا ہے تو جلنے دے، آنسو نہ بہا فریاد نہ کر گایا تھا جو کے ایل سہگل کے انداز میں تھا اور بے حد پسند کیا گیا تھا۔ مظہر خاں نے منور سلطانہ پر بڑی محنت کی اور تراش کر ہیرا بنا دیا۔ اس کے چہرے کے بھی نقائص دور کر دیے۔ بعد میں اس نے اعلان، مجبور، کنیز، سپنی، پیار کی منزل، احسان وغیرہ فلموں میں کام کیا۔ بابل میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی میسر آیا اور یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ ایک جیولر علی جگت سے شادی کر کے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔

اس نے اپنے آپ کو فلمی اسکینڈلوں سے ہمیشہ دور رکھا اور بڑے ایکٹروں کے ساتھ جھوٹے رومانس نہیں لڑائے۔ ایکٹرس ہونے کے باوجود مذہبی احکام کی سختی سے پابند رہی۔ نذر و نیاز اور گیارہویں شریف کی دل سے قائل رہی اور جی جان سے ایسی مجلسوں میں شرکت کرتی رہی۔ اس کو ایک تلخ تجربہ بھی ہوا۔ اس نے ایک گندم نما جو فروش کو اپنے روحانی عقیدے کے مطابق ایک اسلامی کارِ خیر کے لیے دو ہزار روپے کی رقم دی جو ان دنوں گراں قدر تھی لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس شخص کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ منور سلطانہ نے بددعا دی۔ چند روز بعد خبر ملی کہ ایک سڑک حادثے میں اس آدمی کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

خدا پر اعتقاد رکھنے والی فنکارہ

بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کے آخری دور کی مقبول اداکارہ چترا کی پیدائش حیدرآباد دکن میں ہوئی تھی۔ اصل نام افسر بانو تھا اور فلم اسٹار نگار سلطانہ کی قریبی رشتے دار تھی۔ اردو زبان بہ خوبی جانتی تھی اور اس کا تلفظ غضب کا تھا۔ قد کی ذرا چھوٹی تھی مگر اس کی خوب صورتی کی دھاک پوری فلمی دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی۔ فلم انڈسٹری کی بڑی ہستیوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی نگار کی طرح ایک نشہ ثابت ہوگی۔ اپنی ایک سہیلی کے ذریعے فلم ساز جیلین فضلی سے متعارف ہوئی جنھوں نے اسے اپنی فلم 'خوب صورت' میں چھوٹا سا رول دے دیا۔

جب وہ پہلے روز نگار خانے میں پہنچی تو میک اپ کیبن خالی پڑا تھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ خود ہی کریم، پاؤڈر، لوشن وغیرہ لگا کر سیٹ پر پہنچ گئی مگر سب اسے دیکھ کر ہنس پڑے۔ ہدایت کار نے اسے سمجھایا کہ یہاں اپنے ہاتھ سے سنگھار نہیں کیا جاتا، میک اپ مین یہ کام انجام دے گا۔ چناں چہ اسے میک اپ روم میں جانا پڑا جہاں طرح طرح کی شیشیاں اور شیشیاں کھول کر اس کے چہرے کی تزئین کی گئی۔ اس کے بعد ہیئر ڈریسر آئی اور اس نے بھی ایک گھنٹہ بال بنانے میں لگا دیا۔

سیٹ پر چترا کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے مگر ایسا نہ کر سکتی تھی کیوں کہ شوٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ جب اسے کیمرے کے سامنے کھڑا کر کے مکالمے بولنے کے لیے کہا گیا تو چاروں طرف برقی قمقمے دیکھ کر گھبرا گئی، اسے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آنے لگی لیکن اسے خدا پر اٹوٹ اعتقاد تھا۔ اس نے ہدایت کار سے دو منٹ کی اجازت لے کر سیٹ کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اور آنکھیں بند کر کے اللہ کو یاد کیا اور کامیابی کی دعا مانگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاٹ کامیابی سے لے لیا گیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو اپنے مختصر کردار کے باوجود ناظرین کی نگاہوں سے نہ چھپ سکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک درخشندہ ستارہ بن گئی۔ اب وہ برقی قمقموں سے ذرا بھی نہیں گھبراتی تھی۔ کیمرے سے اس کی جھجک بھی غائب ہو چکی تھی۔ پروڈیوسر پی این اروڑا نے اسے اپنی فینٹسی فلم 'چور بازار' میں شوخ و شنگ عربی حسینہ کے روپ میں شمی کپور کے ساتھ پیش کیا تو وہ شہرت کے آسمان پر پہنچ گئی۔ اندر جیت، جگری، چوپٹ راج، اللہ دین کا بیٹا، حاتم، روپ بسنت، نور یمن، عالم آرا، پاک دامن وغیرہ اس کی مشہور فلمیں تھیں۔ زنجیر سب سے زیادہ پسند کی گئی۔

فلم 'چور بازار' میں اس کو ایک منظر میں کمند ڈال کر چڑھتے ہوئے دکھایا جانا مقصود تھا۔ پہلے تو یہ گھبرائی لیکن اس کو اپنے بچپن کی شرارتیں یاد آ گئیں۔ اس نے ایک بار پھر دعا مانگی "یا اللہ مدد کر"۔ کسی غیبی طاقت نے ساتھ دیا اور اس نے آناً فاناً خود کو چھت پر کھڑے سے پایا اور کیمرہ مین کو چلا کر کہا دیکھو میں کہاں کھڑی ہوں۔ سب اس کی بلند حوصلگی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شاٹ کامیابی سے فلما لیا گیا تو سیٹ پر موجود سب لوگوں نے اس نٹ کھٹ حسینہ کو مبارک باد دی۔

نمی کے بالوں کی تراش خراش

جو لوگ آگرہ سے لے کر بمبئی تک نمی کے ساتھ رہے وہ ہمیشہ اس خوب صورت اداکارہ کی دراز زلفوں کی مہک کے قائل رہے۔ نمی جب پہلی بار فلم 'برسات' میں کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی کے کردار میں پردۂ سیمیں پر جلوہ فگن ہوئی تو اس کے بال سالم تھے۔ بمبئی میں وارد ہونے اور فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد وہ سب سے زیادہ جس چیز سے متاثر ہوئی وہ نرگس کے شانوں تک لہراتے ہوئے گیسو تھے۔ نمی چاہتی تھی کہ اس کے گیسو بھی ویسے ہی ہوں اور جب اس کا جی چاہے وہ انھیں جھٹک کر کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف کرے اور جو نرگس کے بالوں کی طرح اس کے رخساروں پر ٹھٹک جائیں۔ تب 'برسات' میں اس کا کام شروع ہو چکا تھا۔

راج کپور کو جب نمی کے ارادوں کا پتا چلا تو بولے "تم اپنے بال اس وقت تک نہیں کٹوا سکتی جب تک فلم میں تمھارا کام ختم نہ ہو جائے، پکچر میں رول کی مناسبت سے تمھارے بال لمبے ہی رہنے چاہئیں، اس سے پہلے چند مناظر تمھارے قدرتی بالوں کے ساتھ فلمائے بھی جا چکے ہیں۔ تمھارے اصلی بالوں کی جگہ نقلی بال لگا کر میں تمھاری شخصیت کو زائل اور اپنی فلم کو برباد نہیں کرنا چاہتا"۔ چناں چہ نمی کو اس روز کے انتظار میں چپ ہو جانا پڑا جب فلم میں اس کا کام ختم ہو جائے۔

جب فلم کے آخری مناظر تک کی شوٹنگ ختم ہو چکی تو راج نے نمی سے کہا کہ اب وہ ہیئر ڈریسر کے پاس جا سکتی ہے۔ جب وہ ہیئر کٹنگ سیلون میں پہنچی تو ہیئر ڈریسر نے پوچھا وہ کس قسم کے بال کٹوانا چاہتی ہے؟ نمی نے جھٹ سے جواب دیا "بے بی نرگس کے ہیں"۔ چناں چہ اس کے بال نرگس کی طرح ہی تراش دیے گئے۔ پہلے تو وہ چپ چاپ آئینے کے سامنے خوشی خوشی بیٹھی رہی۔ جب ڈریسنگ مکمل ہو چکی تو ہیئر ڈریسر نے کہا کہ اب غور سے آئینہ دیکھو اور بتاؤ کہ بال ٹھیک کٹے ہیں یا نہیں؟ جب نمی نے اچھی طرح آئینے میں صورت دیکھی تو پہلے ایک دم بھونچکا سا گئی اور اس نے محسوس کیا کہ اپنی لمبی زلفیں کٹوا کر خود پر ایک ظلم کیا ہے۔ گھر پہنچنے پر جب سب لوگوں نے اس کی زلفوں کی نئی آرائش کی تعریف کی تو اسے بے حد تعجب ہوا۔

گوشۂ عافیت کی تلاش

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جبین (Jabeen) ہندوستانی فلموں کی ایک مشہور اور حسین اداکارہ تھی۔ اس کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۳۱ء کو دلی میں ہوئی تھی۔ پہلی اپریل کو لوگ بے وقوفوں کا دن کہتے ہیں۔ جب اس کے والدین نے بچی کی پیدائش کی خوش خبری اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو سنائی تو سب نے اسے اپریل فول سمجھ کر قبول نہ کیا۔ بڑی ہو کر جبین نے اپنا یوم پیدائش لوگوں کو بتایا تو سننے والے ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی نور نظر تھی۔ اس کا باپ بنگالی اور ماں پنجابی تھی لیکن یہ اتفاق کی بات ہے کہ بنگالی یا پنجابی میں سے کوئی اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ وہ صرف دو ماہ کی تھی جب ہندوستان سے جاپان چلی گئی تھی جہاں اس کے والد جلیل کریم حکومت ہند کے ٹریڈ کمشنر تھے۔ پہلی زبان جو اس نے سیکھی وہ جاپانی تھی، بعد ازاں اس نے اردو اور انگریزی زبانیں سیکھیں۔

سورج دیوتا کی سرزمین جاپان میں یہ ترقی پسند اور خوشحال خاندان چار برس تک رہا اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران وطن لوٹا۔ بمبئی میں اس کے والد کو ڈپٹی کنٹرولر آف ٹیکس کی ملازمت مل گئی اور جبین نے کوئین میری اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد الفنسٹن کالج میں داخلہ لیا۔ اس کا ارادہ کوئی اچھی سی ڈگری لے کر باوقار سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا تھا لیکن والد کا اچانک انتقال ہو گیا اور یہ گھرانا رنج و غم میں ڈوب گیا۔ اس گھرانے کے خیر خواہ ممتاز ہدایت کار ایس ایم یوسف نے اسے اپنی فلم 'گزارا' میں ہیروئن کا رول دیا جو اس نے خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ نئی دلی، جیون ساتھی، فیشن، راگنی، اجنبی، ہم اور تم، رات کے راہی اور چودھری کرنیل سنگھ اس کی مقبول فلمیں تھیں۔

ایک بار اسے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران انوکھا واقعہ پیش آیا۔ شوٹنگ کے بعد وہ آرام کرنے کے لیے کسی جگہ کی تلاش میں تھی جہاں وہ سکون کے ساتھ بیٹھ سکے۔ اس نے ایک راہی سے پوچھا تو اس نے سامنے پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہاں وہاں مکمل آرام کی جگہ ہے"۔ جبیں لمبے لمبے قدم بڑھاتی وہاں پہنچی تو ایک قبرستان پایا۔ اگرچہ راہی نے اس سے مذاق کیا تھا مگر کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا۔ قبرستان — جہاں ان گنت انسان خاک کی چادر اوڑھے ابدی آرام کی نیند لیتے ہیں۔

●●●

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

شدید قلت ہے۔ وہ چار ہیں وہیں حیدرآباد میں صورت حال بہتر ہے اس کے باوجود تقریباً 20 فیصد سرکاری مدارس میں ٹیچنگ اسٹاف کی قلت ہے۔ ایم وی فاؤنڈیشن کے پروگرام ہیڈ کوآرڈینیٹر جناب وینکٹ سوامی کے مطابق سرور نگر کے ایک سرکاری اسکول میں 920 طالب علم زیر تعلیم ہیں لیکن وہاں صرف دو ٹیچرس موجود ہیں جب کہ قانون حق تعلیم کے تحت کسی بھی اسکول میں 30 طالب علموں کے لیے ایک ٹیچر لازمی ہے تاہم ریاست کے زیادہ تر اسکول اس قانون پر عمل نہیں کرتے۔ مسٹر وینکٹ سوامی نے مزید بتایا کہ خاص طور سے پرانے شہر کے اردو میڈیم اسکولوں میں ٹیچروں کی شدید قلت ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

پرانی فلمی یادیں

رازہائے درونِ پردہ

پہلی قسط

وشوا ناتھ طاؤس
C-38، سیکٹر 39
نوئیڈا (یوپی) 201303

اپنی طویل صحافتی زندگی میں راقم نے فلمی دنیا کا بہ غور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور یہاں رونما ہونے والے واقعات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ اس جہانِ رنگ و بو میں میرے قلم و قرطاس نے بارہا گلگشت کی ہے، یہاں کے ہوش ربا نظاروں کا طلسم میرے قلب و ذہن پر محیط ہے۔ حسن بن صباح کی مصنوعی جنت کی طرح نگارخانوں کی یہ بستی ایک سراب سے کم نہیں۔

ان تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود انسانی زندگی کی لطافت اور بلاغت فلمی دنیا میں برقرار ہے۔ میں نے یہاں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں اس طرح سمو دیا ہے کہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ اپنے محاسن و معیوب کے ساتھ موجود ہے۔ صداقت کو آبِ شفاف کی مانند بیان کر دیا اور جو جھوٹ تھا اُسے دھند آبادر سے ہلاک کر دیا ہے۔ زندگی بھر حق کا دروازہ کھٹکھٹایا اور باطل کو ساقط کرتا رہا ہوں ——— وشوا ناتھ طاؤس

حیدرآباد میں سلوچنا کا استقبال

ایک زمانہ تھا کہ جتنے پروانے سلوچنا کے تھے کسی دوسری اداکارہ کے نہ تھے۔ جس فلم میں وہ جلوہ گر ہو کے ساتھ آتی تھی پبلک بے تحاشا سنیما ہالوں پر ٹوٹ پڑتی تھی۔ فلمی مارکیٹ میں اس کی قیمت سب سے زیادہ تھی۔ اُن دنوں بمبئی کے گورنر کی تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ تھی مگر سلوچنا امپیریل فلم کمپنی میں چھ ہزار روپے مہینہ تنخواہ پاتی تھی۔ وہ پونا میں ٹیلی فون آپریٹر تھی کہ فلم ساز موہن بھونانی کی دوربین نگاہوں نے اس ہیرے کو جانچ اور بھانپ لیا۔ انھوں نے اسے اپنے کوہِ نور اسٹوڈیو میں داخل کر لیا اور کئی خاموش فلموں میں ہیروئن بنایا جن میں 'ویر بالا' بڑی مشہور ہوئی۔ اس نے امپیریل فلم کمپنی کی سائلنٹ پکچر 'انارکلی' میں بھی لیڈنگ رول ادا کیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب یہ پکچر آواز کے ساتھ پیش ہوئی تب بھی اُس نے انارکلی کا کردار خوش اسلوبی سے نبھایا۔

انھی دنوں کی بات ہے، سلوچنا کو حیدرآباد پہنچنا تھا۔ حیدرآباد ریلوے اسٹیشن کا بکنگ کلرک تمام پلیٹ فارم ٹکٹ ختم کر چکا تھا۔ ٹرین جب پلیٹ فارم پر پہنچی تو ہجوم کو قابو میں رکھنا دشوار ہو گیا۔ لوگ زبردستی پلیٹ فارم پر گھس آئے تاکہ ایک نظر اپنی محبوب ہیروئن کو دیکھ سکیں۔ حیدرآبادی عوام نے اپنی شاندار روایات کے مطابق اس کا شاہانہ طریقے سے خیر مقدم کیا اور سلوچنا زندہ باد کے فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ اُسے پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا۔ ہار اتنی بڑی تعداد میں تیار ہوئے تھے کہ شہر میں پھول عنقا ہو گئے۔

'ٹائپسٹ گرل'، 'اندرا ایم اے'، 'بمبئی کی بلی'، 'شانِ خدا'، 'ہیر رانجھا'، 'مادھوری'، 'دو گھڑی کی موج' اس کی وہ فلمیں تھیں جنھوں نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا اور فلم پروڈیوسروں کی تجوریاں بھر گئیں۔ راجاؤں اور نوابوں نے اسے ہیرے جواہرات کے ہار تحفے میں بھیجے۔ ہر ریاستی حکمران اسے اپنے محل میں مہمان بنانے پر آمادہ تھا لیکن سلوچنا کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

حسن جب ڈھل گیا تو اس نے 'جگنو'، 'انارکلی'، 'لال حویلی'، 'کاغذ کے پھول'، 'حقیقت'، 'امرپالی'، 'اپنی عزت'، 'انکھیوں کے جھروکے سے'، 'ہنی مون'، 'اپریل فول' وغیرہ فلموں میں ادھیڑ عمر کی یا بڑی عمر کی عورت کے رول نبھائے۔ فلمستان لمیٹڈ کی فلم 'انارکلی' میں شہزادہ سلیم کی ماں کا کردار انجام دیا۔ کئی سال پہلے جب اس کا انتقال ہوا تو اخبارات میں دو سطری خبر چھپی اور بس!

متکلم فلموں کی پہلی ہیروئن زبیدہ

زبیدہ ہندستان کی اولین متکلم فلم 'عالم آرا' کی ہیروئن تھی جسے اردیشیر ایرانی نے تیار کیا تھا۔ ماسٹر وٹھل اس فلم کا ہیرو تھا وہ ایک بہت اچھا اور ہر دلعزیز ایکٹر تھا اور اداکاری کے فن میں ماہر تھا لیکن اس سے ہندستانی ڈائلاگ بلوانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی اس لیے فلم میں اس کے مکالمے بہت کم رکھے جاتے تھے۔ پرتھوی راج کپور، جگدیش سیٹھی اور ڈبلیو ایم خان بھی کاسٹ میں شامل تھے اور یہ تینوں اردو زبان بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ زبیدہ خاموش فلموں کے دور کی مشہور اداکارہ فاطمہ کی بیٹی تھی اور اس کی دو اور بہنیں سلطانہ اور شہزادی بھی فلموں سے وابستہ تھیں۔ زبیدہ پہلے کچھ خاموش فلموں میں بھی پارٹ لے چکی تھی۔ اردو اس کی مادری زبان تھی اور وہ اسے روانی کے ساتھ بول سکتی تھی۔ اُس کی صورت من موہنی اور آواز پیاری تھی اس لیے 'عالم آرا' میں اسے پسند کیا گیا اور وہ چل نکلی۔ اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ جب بھی فلم کے شروع میں ٹائٹلوں میں اس کا نام آتا تو خواندہ حضرات اونچی آواز سے اسے پڑھتے تاکہ جو ناخواندہ ہیں وہ بھی سن لیں۔ 'عالم آرا' پر یورش کا عالم یہ تھا کہ اُس زمانے میں بلیک میں اس کے ٹکٹ پچاس پچاس روپے میں فروخت ہوئے۔ تماش بین ٹکٹ خریدنے کے لیے صبح سے ہی لائن میں لگ جاتے تھے۔

اس کی فلم 'زرینہ' پر بڑی لے دے ہوئی اور اس کے رول کو لچر قرار دیا گیا اور لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا مگر فلم کی نمائش جاری رہی۔ بعد ازاں زبیدہ نے ایک دھارمک فلم میں رادھا کا کردار نبھایا تو عوام نے اعتراض اٹھایا کہ ایک رقاصہ کو یہ رول ادا کرنے کا حق نہیں، لیکن یہ احتجاج بے اثر رہا۔ سنسر بورڈ فلم پاس کر چکا تھا اور وہ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا کہ کس نے کیوں یہ رول ادا کیا ہے۔ وہ اداکاری کے فن کو کسی مذہب یا پیشے سے جوڑنے کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اس تمام شور شرابے سے نجات پانے کے بعد زبیدہ نے ۱۹۳۴ء میں ڈائرکٹر نانو بھائی وکیل کے اشتراک سے مہالکشمی مووی ٹون کی بنیاد رکھی اور 'گل صنوبر' اور 'رشکِ لیلیٰ' جیسی فلمیں بنائیں جو مالی اعتبار سے اچھی ثابت ہوئیں۔ نانو بھائی وکیل میں خوبی یہ تھی کہ وہ کم بجٹ کے ساتھ ایک فارمولا فلم تیار کرتے تھے اور تھوڑے وقت میں اسے مکمل کر دیتے تھے جس کے باعث اخراجات کا بوجھ نہیں بڑھتا تھا۔

زبیدہ نے حیدرآباد کے ممتاز رئیس مہاراج نرسنگھ گردھراج گیر بہادر سے رشتۂ ازدواج استوار کیا اور زندگی کے آخری ایام دھن راج پیلس میں بسر کیے۔ 91 سال کی لمبی عمر پانے کے بعد ۱۹۸۸ء میں اس کا انتقال ہوا۔

ایکٹرس کی بددعا کا اثر

منور سلطانہ ایک زمانے میں لاہور کے بدنام شاہی محلہ (ہیرا منڈی) میں رنگین زندگی گزار رہی تھی اور کبھی کبھار ریڈیو اسٹیشن پر گا لیتی تھی۔ اس کی تعلیم بھی صرف گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے فلمیں دیکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ نگر محلے کے شاہی تھیٹر میں کثرت سے فلمیں دیکھا کرتی تھی اور گھر واپس آکر اداکاروں کی نقلیں اتارا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے خدا کا نام لے کر مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس پراگندہ ماحول سے چھٹکارا پا کر رہے گی۔ حوصلہ کر کے اس نے ماں سے اپنا عندیہ بیان کر دیا۔ ماں نے پوچھا تو پھر کیا کرو گی؟ دلیر بیٹی نے جواب دیا کہ فلموں میں کام کر کے عزت کی روٹی کماؤں گی۔ ماں یہ جواب سن کر خوش ہوئی۔ بیٹی نے فلم اسٹوڈیوز کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ اُن دنوں ملک کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا اور لاہوری فلم انڈسٹری کو ہندو مسلمان یکساں ترقی دینے میں جٹے ہوئے تھے۔ 'خزانچی' اور 'خاندان' جیسی فلموں کی شاندار کامیابی نے لاہور کو بمبئی کی فلم نگری کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ مہیشوری پکچرز کے مالکان رام مہیشوری اور پدم مہیشوری سے منور سلطانہ کا رابطہ قائم ہوا اور اسے فلم 'پگلی' میں ہیروئن کا کردار مل گیا۔ فلم جب نمائش کے لیے پیش ہوئی تو اسے کسی نے پسند نہیں کیا۔ ہدایت کاری ناکارہ، کہانی کمزور، مکالمے پھیکے اور نغمات بے سُرے تھے۔ گھٹیا قسم کے میک اپ اور سستے کاسٹیوم نے ہیروئن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ ہیروئن کے چہرے کے Pimples نمایاں تھے اور اس کے چہرے کے سامنے کے دونوں بڑے دانت اداکارہ ثریا کے دانتوں کی طرح بدنما لگ رہے تھے۔

منور سلطانہ قسمت آزمائی کے لیے بمبئی پہنچی اور ۱۹۴۶ء میں ہدایت کار نظیر خان کی مسلم سوشل فلم 'پہلی نظر' میں

(بقیہ صفحے پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲ – راؤز ایونیو، نئی دہلی – ۱۱۰۰۰۲
قیمت فی شمارہ: دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
http://www.atuh.org